© rasailojaraid.com

(ملکہ خان بہادر صاحب کے بقول اس خدمت پر سراہے بھی) کو ایسے کسی اور دین کے نظام میں کارکن وخدمت گزار بن جائیں اور اسے کامیابی کے ساتھ چلانے میں اپنی قابلیتیں صرف کر دیں۔ وہ ساری دنیا کے باشندوں میں سے چھانٹ کر ایک امت خاص اس مقصد کے لیے بنائے بھی کہ اس معروف کا حکم دے جسے اس نے معروف قرار دیا ہے اور اس منکر کو مٹائے جسے اس نے منکر ٹھیرایا ہے اور پھر اسی امت کے لیے اس بات کو حلال بلکہ اس کے بعض "برگزیدہ" افراد کے لیے فرض کفایہ بھی ٹھیرا دے کہ ان منکرات کو قائم کرنے اور رواج دینے میں حصہ لیں جنھیں اس کے باغی معروف ٹھیرا چکے ہیں اور ان معروفات کو بدلنے اور مٹانے میں آلۂ کار بنیں جو اس کے نافرمانوں کی نگاہ میں منکر قرار پا چکے ہیں۔ یہ ایسی صریح متناقض باتیں ہیں جن کے تناقض کو سمجھنے کے لیے کسی گہرے غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے، لیکن جو لوگ تفسیریں لکھنے اور فقہ و معقولات کے درس دینے کی قابلیت رکھتے ہیں اور جو اتنی عقل رکھتے ہیں کہ کلکٹری اور دیوانی جیسے بڑے بڑے مناصب کی ذمہ داریاں سنبھال سکیں انھیں ان باتوں میں کوئی تناقض نظر نہیں آتا یا پھر خداوند عالم کے متعلق ان کی رائے اتنی بری ہے کہ وہ اس سے ان بے عقلیوں اور نادانیوں کی توقع رکھتے ہیں جنھیں ایک جاہل گنوار بھی اپنی چوپال کے کسی رفیق میں پا کر صبر نہیں کر سکتا۔

خان بہادر صاحب اپنے اسی مضمون میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:۔

> "ایک بعد کی آیت سے بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف کے خزائن مصر پر متصرف ہونے کے بعد تک فرعون مصر کی سلطنت قائم تھی اور فرعون مصر کا دین ہی ملک میں جاری تھا...... ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک الا ان یشاء اللہ (وہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین میں اس بادشاہ کے مگر جو چاہے اللہ) یہ عبارت صاف بتاتی ہے کہ مصر کا ملکی قانون اس وقت تک مصر میں جاری تھا۔"

ان الفاظ کو تحریر کرتے وقت صاحب موصوف جس بات کے ثابت کرنے کی دُھن میں لگے ہوئے تھے اس نے شاید انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ کچھ دیر ٹھیر کر اس صریح تناقض پر غور کر لیتے جو ان کی مزعومہ تفسیر کے لحاظ سے یہاں قرآن کے بیان میں پیدا ہو جاتا ہے۔ براہ کرم اب وہ ہمارے ہی توجہ دلانے سے غور فرمائیں۔ یہاں خود ان کے اعتراف کے مطابق مصر کے ملکی قانون کو، جو فرعون مصر کی حاکمیت کی بنا پر بنا تھا، "دین الملک" (بادشاہ کا دین) قرار دیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر دین صرف اس پوجا پاٹ ہی کا نام نہیں ہے جو مندروں اور معبدوں میں کی جاتی ہے بلکہ اس قانون کا نام بھی ہے جس کے مطابق پولیس مجرموں کو پکڑتی ہے، جس کے تحت عدالت معاملات دیوانی و فوجداری کا فیصلہ کرتی ہے، جس کی پیروی میں ملک کا انتظام چلایا جاتا ہے اور جس پر تمدن کا سارا انتظام قائم ہوتا ہے۔ زندگی کے یہ سارے شعبے بحیثیت مجموعی جس طریقے پر چلتے ہیں اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں "دین" ہے۔ اور چونکہ ملک مصر میں وہ طریقہ فرعون کی مشیت سے ماخوذ اور اس کے اقتدار اعلیٰ پر مبنی تھا اس لیے قرآن اس کو "دین الملک" کہہ رہا ہے۔ اسی سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ "دین اللہ" بھی صرف اس چیز کا نام نہیں ہے جو سجدوں اور نماز روزے تک محدود ہو بلکہ اس سے مراد بھی اس پوری شریعت کی پابندی ہے جو اللہ کی رضا سے ماخوذ اور اس کی حاکمیت پر مبنی ہو اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لے لے۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نبی ہونے کی حیثیت سے کس کام کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے؟ "دین اللہ" کی دعوت دینے کے لیے؟ یا "دین الملک" کو فروغ دینے کے لیے؟ اگر خان بہادر صاحب کی تاویل اور ان حضرات کی تفسیر جن کے بڑے بڑے نام لے کر خان بہادر صاحب ہم کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں، مان لی جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو اپنے نبی کو اس بات پر مامور فرمایا کہ اس کی مخلوق کو اور خصوصاً اس مخلوق کو جو مصر میں رہتی تھی "دین اللہ" اختیار کرنے کی دعوت دے، اور دوسری طرف وہی نبی خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت و نگرانی میں "دین الملک" کے قیام و استحکام کی خدمت انجام دینے لگا اور لطف یہ ہے کہ اللہ میاں اس صریح تناقض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرزِ عمل کا تناقض محسوس تو کیا فرماتے الٹا اس نبی کے اس فعل کو، خان بہادر صاحب کے اپنے الفاظ میں، سراہنے لگے اور نظامِ کفر میں اپنے نبی کے بعدۂ وزارت فائز ہوجانے کو "انعامِ خداوندی" سے تعبیر فرمانے لگے، گویا کہ اللہ میاں کا حال بھی معاذ اللہ ہمارے موجودہ زمانے کے ان دین دار بزرگوں کا سا ہے جو خود تو پیشانی پر سیاہ گٹے لیے ہوئے مصلے پر سبحہ گردانی فرما رہے ہوتے ہیں مگر صاحبزادے جب ایم اے پاس کر کے نیم انگریز بنے ہوئے آبکاری کی انسپکٹری پر فائز ہوجاتے ہیں تو وہی دین مجسم بزرگ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ان کے خاندان کو اپنی نعمت سے نواز دیا۔

آگے چل کر خان بہادر صاحب پھر فرماتے ہیں:

"اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ملک مصر کی وزارت پر متمکن ہوجانے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے تبلیغ حق کا کام نہیں کیا یا اپنی رسالت کے اعلان سے گریز کیا۔ برخلاف اس کے صاحب ممدوح نے اس وقت جبکہ آپ جیل میں تھے اسی وقت وحدانیت کی تبلیغ شروع کر دی تھی۔ ...... البتہ جو بات ان آیات سے بلا شک و شبہہ کے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ایک غیر اسلامی نظام حکومت کے رکن خود اپنی خواہش اور درخواست پر بنے اور حضرت یوسف کے اس حکومت کے رکن بننے کے بعد بھی ملک میں غیر اسلامی نظام حکومت اور غیر اسلامی قانون ہی نافذ رہا۔"

یہاں پھر کھلا ہوا تناقض پایا جاتا ہے جس کی طرف صاحب موصوف نے اپنے مدعا کی دُھن میں توجہ نہیں فرمائی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے آخر کس قسم کی وحدانیت کی تبلیغ فرمائی تھی؟ اگر اس "وحدانیت" کے معنی یہ تھے کہ وہ پوجا جو معبدوں میں کی جاتی ہے اور وہ اطاعت قانون جس پر سوسائٹی کا نظم اور ملک کا انتظام قائم ہوتا ہے ایک ہی خدا کے لیے ہو، یعنی پوری زندگی دین اللہ کی تابع ہوجائے، تو خان بہادر صاحب کی تاویل کے لحاظ سے حضرت یوسفؑ نے خود اپنی اس تبلیغ حق کے خلاف عمل کیا۔ اور اگر یہ تبلیغ اس بات کی تھی کہ معبدوں میں "دین اللہ" جاری ہو اور ملک اور سوسائٹی کا سارا انتظام "دین الملک" پر بدستور چلتا رہے تو ظاہر ہے کہ یہ وحدانیت کی نہیں بلکہ ثنویت اور دورنگی کی تبلیغ تھی۔ پھر مزید سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنی رسالت کا اعلان آخر کس معنی میں کیا تھا؟ اگر انھوں نے فرعون سمیت تمام لوگوں سے یہ کہا تھا کہ میں بادشاہ زمین و آسمان کا نمائندہ ہوں لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، جیسا کہ تمام انبیاء کہتے رہے ہیں فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ، تو اس اعلان کے ساتھ ان کا فرعون کی بادشاہی تسلیم کرنا اور اس کی اطاعت میں اسلامی نظام کے بجائے غیر اسلامی نظام کی خدمت انجام دینا کسی طرح مطابقت نہیں رکھتا۔ اور اگر انھوں نے یہ کہا تھا کہ لوگو! میں ہوں تو بادشاہ ارض و سما کا نمائندہ مگر میرا مسلک یہ ہے کہ فرعون مصر کی اطاعت کروں اور تم کو بھی یہی دعوت دیتا ہوں کہ اسی کی اطاعت کرو، تو صرف یہی نہیں کہ یہ ایک صریح متناقض بات کا اعلان تھا جس کا استقبال سنجیدگی کے بجائے قہقہے کے ساتھ ہونا چاہیے تھا اور ایسا اعلان کرنے والے کو ایوان وزارت کے بجائے پاگل خانے میں جگہ ملنی چاہیے تھی، بلکہ آج بھی ایسی کتاب ہرگز ایمان لانے کے قابل نہیں رہتی جو ایک طرف تو خود ہی یہ قاعدہ کلیہ بیان کرتی ہے کہ "خدا نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کے تحت وہ مطاع بن کر رہے" (وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ) اور دوسری طرف وہی کتاب ایک ایسے شخص کو رسول بھی قرار دیتی ہے جو مطاع بن کر نہیں بلکہ غیر اللہ کا مطیع بن کر رہا اور دوسرے بندگانِ خدا کو بھی اذنِ خداوندی کے تحت اپنا نہیں بلکہ اسی غیر خدا کا مطیع بناتا رہا۔ قرآن اپنے من جانب اللہ ہونے کے ثبوت میں خود یہ معیار پیش کرتا ہے کہ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا، یعنی اگر یہ کتاب اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو لوگ اس میں بہت کچھ اختلاف بیان پاتے۔ لیکن اگر ہم خان بہادر صاحب اور ان کے طرز خیال کے لوگوں کی تاویلات تسلیم کرلیں تو قرآن کے بیانات میں یہاں ایسے کھلے ہوئے تناقضات پائے جائیں گے جن سے قرآن آپ اپنے ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیش کردہ معیار کی رو سے اللہ کے سوا کسی اور کا کلام قرار پائے گا، بلکہ وہ "اوُژ بیڈ" جس کی تصنیف اسے سمجھائے گا بہرحال کوئی صحیح الدماغ انسان تو نہ ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ خان بہادر صاحب جس طرزِ خیال کی نمائندگی فرما رہے ہیں وہ اپنے پیچھے اخلاقی انحطاط کی ایک طویل اور دردناک تاریخ رکھتا ہے۔ مسلمان جب اپنے اصل مقصدِ زندگی کو بھول گئے اور اپنے حقیقی مشن کو چھوڑ کر دنیا پرستی میں مبتلا ہوگئے اور دین داری کے معنی ان کی نگاہ میں صرف یہ رہ گئے کہ عبادات اور معاشرت میں چند شرعی طور طریقوں کی پابندی کی جاتی رہے خواہ مقاصدِ زندگی وہی ہوں جو دنیا پرستوں کے ہوتے ہیں، خواہ نظامِ اجتماعی کی زمامِ کار صالحین کے ہاتھ میں ہو یا فجار کے ہاتھ میں، اور خواہ اجتماعی امامت اپنے اصول اور نصب العین کے اعتبار سے اسلامی ہو یا غیر اسلامی، تو اس غفلت کی سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں اس شکل میں دی گئی کہ ان کی بڑی بڑی آبادیاں پے در پے کفار کی تابع فرمان ہوتی چلی گئیں۔ لیکن انھوں نے اور ان کے علما نے اسے سزا سمجھنے اور اس اصلی قصور کی جس کی پاداش میں یہ سزا ملی تھی، تلافی کرنے کے بجائے الٹا یہ سوچنا شروع کر دیا کہ نظامِ کفر میں "اسلامی زندگی" کیسے بسر کی جائے۔ چنانچہ "اضطرار" کے بہانے سے اس شرعی اور اسلامی زندگی کا ایک نیا نقشہ مرتب کیا گیا جو غیر شرعی اور غیر اسلامی نظام کے اندر بسر کی جاسکے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید سزاؤں کا سلسلہ شروع ہوا تاکہ انھیں آزمایا جائے کہ یہ سنبھل کر پلٹتے ہیں یا اپنی ضلالت میں بعید سے بعید تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اضطرار جسے ابتداءً صرف ایک ہی اضطرار سمجھا گیا تھا، اللہ کی سنت کے مطابق آگے بڑھا اور اس نے دائمی، روز افزوں اور غیر متناہی اضطراروں کی شکل اختیار کر لی، اور ہر نئے اضطرار نے مطالبہ کیا کہ جو حدود تم نے کفر کے اندر اسلام اور کفر کے ماتحت اسلامی زندگی کے لیے تجویز کیے ہیں انھیں سکیڑو اور سکیڑتے چلے جاؤ۔ مگر یہ جتنے عذاب خدا کی طرف سے آئے ان میں سے کسی نے بھی مسلمانوں کی آنکھیں نہ کھولیں اور انھوں نے یہ قاعدہ طے کر لیا کہ دائمی ہر اضطرار کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اسلامی زندگی کے حدود سکیڑتے رہیں اور تسلطِ کفر کی حدوں کو پھیلنے دیں۔ پھر اس "اضطرار" کے تصور نے بھی انھیں ستانا شروع کیا کیونکہ اضطرار کے نیچے حرمت کا تصور لازماً موجود رہتا ہے۔ کون صاحبِ عقل اس صریح بات کو محسوس نہ کرے گا کہ جب آپ محض مضطر ہونے کی وجہ سے سور کا گوشت کھائیں گے تو بہرحال سور آپ کی نگاہ میں حرام تو ضرور ہی رہے گا۔ اور جب اسے آپ فی الاصل حرام سمجھتے ہوئے مجبوراً کھائیں گے تو ناممکن ہے کہ آپ کے دل میں اس سے نفرت و کراہیت نہ ہو، ناممکن ہے کہ آپ اس سے لذت لیں، شوق سے کھائیں، زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور پیٹ بھر کر کھانے کی کوشش کریں اور اس کے کباب اور قورمہ اور پلاؤ پکوانے کی فکر کریں۔ ایسا ہی تنفر اور اجتناب ان تمام معاملات میں بھی ناگزیر طور پر پیدا ہوتا ہے جنھیں آپ حقیقت کے اعتبار سے حرام سمجھتے ہوں اور صرف اضطرار کی وجہ سے اپنے لیے عارضی طور پر جائز کر لیں۔ مگر ایک پوری قوم کا اپنی زندگی کے سارے تمدنی، معاشی، سیاسی معاملات میں دائماً اس طرح رہنا کہ اس پر اضطرار کی شرعی و نفسیاتی کیفیت طاری رہے اور وہ حاضر الوقت نظامِ زندگی سے نفرت و کراہیت کے ساتھ ہمہ گیر اجتناب کرتی رہے اور صرف اس حد تک اس سے تعلق رکھے جس حد تک ایسا تعلق جینے کے لیے ناگزیر ہو، عملاً محال ہے۔ ایسی حالت کو ایک قلیل مدت سے زیادہ برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ بہت جلدی طبائع اس سے تھک جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ تھکاوٹ بھی مسلمانوں میں ٹھیک اپنے وقت پر پیدا ہوئی۔ لیکن پہلے سے دینی انحطاط جس تسلسل کے ساتھ بڑھتا چلا آرہا تھا اس نے ان تھکنے والوں کے ذہن کو اس طرف متوجہ نہ ہونے دیا کہ اپنے اس غلط نظریہ پر نظرِ ثانی کرتے جو "نظامِ کفر میں اسلامی زندگی" کے امکان کے متعلق انھوں نے ابتداءً قائم کیا تھا اور اس حالتِ اضطرار کو ختم کرنے کی تدبیریں سوچتے جس کی وجہ سے وہ ہر طرف ہر شعبۂ زندگی میں حرمتوں سے محصور اور خبائث میں مبتلا ہونے پر مجبور ہوگئے تھے۔ اس کے برعکس دینی انحطاط کی سابق رفتار انھیں جس رخ پر بڑھا لے گئی وہ یہ تھا کہ سرے سے "اضطرار" کے بہانے ہی کو ختم کر دیں تاکہ جو حرمتیں نظامِ کفر میں ترقیات اور آسائشوں کے دروازے ان پر بند کیے ہوئے ہیں وہ ٹوٹ جائیں اور اباحت و حلت میں تبدیل ہو کر رہیں۔ اس غرض کے لیے دین کا ایک نیا نظریہ قائم کیا گیا کہ اس کا تعلق صرف عقائد و عبادات اور چند معاشرتی امور مثلاً نکاح و طلاق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ہے۔ اگر ان معاملات میں کوئی نظام حکومت مسلمانوں کو امن دینے کا ذمہ لے لے تو اسلامی زندگی کا اصل مدعا حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دارالکفر دارالامن ہے، اس کی وفاداری و اطاعت لازم ہے، اس کے تحت سارے تمدنی معاملات (جو اس نئے نظریہ کے مطابق دنیا بمقابلہ دین کے زیر عنوان آجاتے ہیں) انہی قوانین کے مطابق چلنے چاہییں جو کافرانہ اصولوں پر بنائے گئے ہوں، اور اس کی قانونی و انتظامی مشین کو چلانے میں بلکہ اس کے تحفظ اور اس کی توسیع کے لیے جان و مال کی قربانیاں تک دینے میں بھی کوئی "مضائقہ" نہیں ہے۔ لیکن یہ معاملہ صرف "عدم مضائقہ" یا اباحت و حلت پر ہی نہ رکا بلکہ دارالکفر میں مسلمانوں کی ضروریات نے جلدی ہی انھیں مجبور کرنا شروع کیا کہ اپنی نئی نسلوں کو خدمتِ کفر کا شوق دلانے کی کوشش کریں تاکہ ان نقصانات کی تلافی ہو جو اول اول کچھ مدت کے "مضائقہ" نے انھیں پہنچا دیا تھا۔ اس لیے ایک آخری دلیل یہ تصنیف کی گئی کہ مسلمانوں کی ترقی و فلاح، اور بعض حالات میں ان کی زندگی کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ وہ نظام کفر کے عدالتی، تشریعی، انتظامی، فوجی، صنعتی، غرض تمام شعبوں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں ورنہ امت کے وفات پا جانے یا کم از کم ترقی کی دوڑ میں غیر مسلموں سے پیچھے رہ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس دلیل نے بیک جنبش قلم اُسی چیز کو جو کل تک صرف مباح کے مقام پر تھی فرض کے درجہ پر پہنچا دیا اور واجب ہو گیا کہ اگر ساری قوم نہیں تو اس میں سے ایک طبقہ تو اس فرض کے انجام دینے کے لیے ضرور نکلتا ہی رہے۔ گویا حکم الٰہی اب یوں قرار پایا کہ فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الكفر وليُضلّوا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يَضلّون اور ولتكن منكم امة يدعون الى الخُنزير ويامرون بالمنكر وينهون عن المعروف۔

یہی وہ عظیم الشان ترمیم تھی جس کی بدولت بڑے بڑے متقی و دیندار حضرات تسبیحوں کو گردش دیتے ہوئے وکالت اور منصفی کے پیشوں میں داخل ہوئے تاکہ جس قانون پر وہ ایمان نہیں رکھتے اس کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کریں اور کرائیں اور جس قانون پر ایمان رکھتے ہیں اس کی تلاوت صرف اپنے گھروں میں کرتے رہیں۔ اسی ترمیم کی بدولت بڑے بڑے صلحا و اتقیا کے بچے نئی درسگاہوں میں داخل ہوئے اور وہاں سے بے دینی و مادہ پرستی اور بد اخلاقی کے سبق لے کر نکلے اور پھر اس نظام کفر کے صرف عملی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ اکثر معاملات میں اخلاقی و اعتقادی حیثیت سے بھی خدمت گزار بن گئے جو ان کے اسلاف کی غفلتوں اور کمزوریوں کی بدولت ان پر ابتداءً محض اوپر سے مسلط ہوا تھا۔ پھر اسی ترمیم نے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ مردوں سے گذر کر جاہلیت اور ضلالت اور بد اخلاقی کا طوفان عورتوں تک پہنچا، دینی فرض کفایہ جسے ادا کرنے کے لیے پہلے مرد اٹھے تھے، عورتوں پر بھی عائد ہو گیا، اور ان بیچاریوں کو بھی آخر اس "دینی خدمت" کی بجا آوری کے لیے نکلنا پڑا، نہ نکلتیں تو خطرہ تھا کہ کہیں غیر مسلم ان سے بازی نہ لے جائیں!

اور کہیں یہ گمان نہ کر لیجیے گا کہ دین میں یہ ترمیم آج کچھ نئی ہوئی ہے۔ درحقیقت اس کی بنا آج سے صدیوں پہلے پڑ چکی تھی جبکہ تاتاری کفار مسلمانوں پر مسلط ہوئے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ "نظام کفر میں اسلامی زندگی" کا نقشہ پہلی مرتبہ اسی دور کے علماء نے مرتب کیا تھا، بلکہ اسی زمانہ میں بڑے بڑے علماء و صلحاء نے خود نظام کفر کی خدمت گزاری اختیار فرمائی تھی، اور ان میں بکثرت لوگ وہ تھے جن کی کتابیں پڑھ پڑھ کر آج ہمارے مدارس عربیہ میں علماء دین و مفتیان شرع متین تیار ہوتے ہیں۔ اسی قدامت کی وجہ سے یہ غلطی ایک مقدس غلطی بن چکی ہے اور کوئی تعجب نہیں ہے اگر ہمارے زمانہ کے فقیہ اور محدث اور مفسر سب اس میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ غلط بات نہ اس دلیل سے صحیح ہو سکتی ہے کہ وہ پہلے سے ہوتی چلی آرہی ہے، اور نہ اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ بڑے بڑے لوگ اس میں مبتلا ہوئے ہیں۔ حق کا اثبات اگر ہو سکتا ہے تو خدا کی کتاب اور رسولوں کی سنت ہی سے ہو سکتا ہے۔

اس پورے انحطاط کے دوران میں، جو ابتدائی اضطرار کی بنا پر "اسلام زیر سایۂ کفر" کے نظریہ سے شروع ہوا، پھر رفتہ رفتہ "نظام کفر کی خدمت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائز ــــ مستحب ــــ "فرض کفایہ" کے نظریے تک پہنچا، اور بالآخر گرتے گرتے اس انتہائی ذلیل نقطۂ نظر کی پستیوں میں جا گرا کہ "مذہبی آزادی دینے والے حکمرانوں کی وفاداری عین مقتضائے دین ہے۔" مسلمانوں کی کوشش یہ بھی رہی کہ اپنے تنزل کے ہر مرحلے میں نیچے اور زیادہ نیچے اترنے کے لیے دلیل بہر حال انھیں خدا کے دین ہی سے ملنی چاہیے۔ یہ مطالبہ بظاہر تو ان کے زعم میں اس فارمولے پر مبنی تھا کہ "خدا کا دین چونکہ ہماری تمام ضرورتوں کا ضامن ہے اس لیے جو ضرورتیں اب ہمیں پیش آ رہی ہیں ان کو پورا کرنے کے لیے بھی اسی دین سے ہم کو رہنمائی ملنی چاہیے۔" لیکن در اصل اس ظاہری فارمولے کے باطن میں جو حقیقی فارمولا چھپا ہوا تھا اور جس پر فی الواقع یہ لوگ کام کر رہے تھے وہ یہ تھا کہ "جب ہم نے اس دین پر یہ احسان کیا ہے کہ اس کو اپنے ایمان سے سرفراز کیا تو اس کے بدلے میں کم سے کم جو فرض اس دین پر عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ہمارے آگے چلنے کے بجائے ہمارے پیچھے چلنا شروع کر دے۔ یعنی اب ہمارا اور اس کا تعلق یہ نہ ہو کہ ہم اسے اپنے اوپر اور خدا کی زمین پر قائم کرنے کی سعی کریں اور اس سعی کے سلسلے میں جو جو ضرورتیں ہم کو پیش آتی جائیں یہ انھیں پورا کرنے کی ضمانت لیتا جائے، بلکہ تعلق کی صورت اب یہ ہونی چاہیے کہ ہم اس کی اقامت کا کام حتیٰ کہ اس کا خیال تک چھوڑ کر اپنے نفس کی پیروی میں جس جس وادی کی خاک چھانتے پھریں اس میں یہ ہمارے ساتھ ساتھ گردش کرتا رہے اور جن جن ادیانِ باطلہ کے ہم تابع فرمان بنتے جائیں ان کے ماتحت ساری غلامانہ حیثیتیں یہ بھی اختیار کرتا چلا جائے، اور اس کے منشا کے خلاف جو جو طرزِ زندگی ہم قبول کریں ان میں پیش آنے والی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا یہ ضامن ہو۔" چنانچہ اسی غلط نقطۂ نظر کو لیے ہوئے ان لوگوں نے قرآن اور سنت میں رہنمائی تلاش کرنی شروع کی اور حاصل یہ ہوا کہ پورے قرآن میں اگر کسی چیز پر جا کر ان کی نگاہ ٹھیری تو وہ نہ سورۂ عنکبوت تھی نہ بقرہ، نہ آلِ عمران، نہ انفال، نہ توبہ، بلکہ صرف سورۂ یوسف تھی اور اس کے بھی وہ مقامات جن سے خان بہادر صاحب استدلال فرما رہے ہیں۔ اسی طرح پوری سیرتِ نبوی میں بھی اگر کوئی چیز ان کو قابلِ اتباع ملی تو وہ نہ مکے کی تپتی ہوئی ریت تھی، نہ طائف کی سنگ باری، نہ بدر و احد کے میدان بلکہ صرف یہ واقعہ کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ہجرت کر کے حبش گئی تھی اور وہاں ایک عیسائی بادشاہ کے ماتحت رعایا بن کر رہی!

لیکن جو شخص مطلب جویانہ نیت نہ رکھتا ہو بلکہ طالب حق ہو اس کے لیے یہ سوال غایت درجہ اہمیت رکھتا ہے کہ درحقیقت سورۂ یوسف کے زیر بحث واقعات اور ہجرتِ حبشہ کے حالات سے بھی کیا وہی نتیجہ نکلتا ہے جو یہ حضرات نکالنا چاہتے ہیں؟ اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہی نتیجہ نکلتا ہے یعنی یہ کہ ایک نبی نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت ایک نظامِ کفر کی خدمت اور ایک غیر الٰہی قانون (دینُ الملک) کے اجرا و نفاذ کی ذمہ داری دسی غرض کے لیے قبول کی تھی کہ ایسا کرنا فی نفسہٖ مقصود تھا اور یہ کہ مسلمانوں نے مکے سے حبش کی طرف اسی بنیاد پر ہجرت کی تھی کہ ایک مسلم جماعت کے لیے ایک غیر مسلم نظامِ تمدن و سیاست بالکل ایک موزوں مقام ہے بشرطیکہ وہ مسجد میں اپنے منشا کے مطابق پوجا کر لینے کی اور اپنے سینے میں کچھ عقائد رکھ لینے اور زبان سے ان کے پھاگ اڑا لینے کی اس کو اجازت دے دے، تو اس کے بعد کچھ مزید سوالات پیدا ہوتے ہیں جو اوپر کے سوال سے بھی بدرجہا زیادہ اہم اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، کیونکہ یہ بات مان لینے کے بعد تو یہی امر تحقیق طلب ہو جاتا ہے کہ:

(۱) اللہ تعالیٰ نے جو دین انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے نوعِ انسانی کے لیے بھیجا آیا وہ صرف عبادت گاہ کے لیے تھا یا پوری انسانی زندگی کے لیے؟

(۲) اور جو انبیاء اس دین کو لے کر آئے وہ سارے کے سارے ایک ہی مقصد کے لیے آئے تھے اور ایک ہی ان کا مشن تھا یا مختلف مقاصد اور مختلف مشنوں کے لیے، جن میں سے بعض مشن بعض کی ضد پڑتے ہوں؟

(۳) اور یہ کہ انسان سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ فی الواقع کیا ہے؟ ــــ اپنی پوری زندگی میں اس کی بندگی کرے اور اسی کے قانون کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

متابعت میں کام کرے یا صرف پوجا اس کی کرتا رہے اور باقی اپنے سارے معاملات جن طریقوں پر چاہے چلاتا رہے؟

ان سوالات کا ایک جواب یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ نے جو دین بھیجا ہے اس کا تعلق صرف اُس محدود زندگی سے ہے جو آجکل کے تصور کے لحاظ سے "مذہبی" کہلاتی ہے، مگر یہ مان لینے کے بعد قرآن میں اور دوسری کتب آسمانی میں تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون دیوانی و فوجداری، ضوابطِ شہادت و عدالت اور مسائل صلح و جنگ وغیرہ کے متعلق جو ہدایات دی گئی ہیں وہ سب بے معنی قرار پاتی ہیں یا پھر ان کی حیثیت احکام کی نہیں بلکہ سفارشات کی رہ جاتی ہے، جن پر عمل ہو جائے تو اچھا اور نہ ہو تو اللہ میاں کو کوئی خاص شکایت نہ ہوگی۔

اسی طرح دوسرے سوال کا جواب بھی یہ ہوسکتا ہے اور ہو سکتا کیا معنی، آجکل عام طور پر نبوت کا تصور یہی ہے کہ مختلف انبیاء مختلف مشن لے کر آئے ہیں، حتیٰ کہ ایک نبی کا مقصد بعثت اگر یہ رہا ہے کہ نظام کفر کو توڑنے کے لیے لڑے اور اس کی جگہ نظام اسلامی کو زمین پر حکمران ہونے کی حیثیت سے قائم کرے تو دوسرے نبی کا مقصد بعثت اس کے برعکس یہ رہا ہے کہ نظام کفر کے اندر نہ صرف یہ کہ محدود قسم کی مذہبی و اخلاقی اصلاح پر اکتفا کرے، بلکہ اس نظام کفر کا مطیع و وفادار بن کر رہے اور موقع ملے تو اس کو چلانے اور فروغ دینے کے لیے اپنی خدمات خود پیش کرے۔ مگر یہ بات نہ قرآن کے بیان کے مطابق ہے جو پورے زور کے ساتھ یہ تصور پیش کرتا ہے کہ سارے انبیاء کا مقصد بعثت ایک ہی تھا اور نہ عقل یہ باور کرنے کے لیے تیار ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسی متضاد اور متصادم حرکات کا ظہور ہوسکتا ہے۔ شاید کوئی معقول آدمی بھی اُس خدا کو ایک حکیم خدا ماننے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا جو انسانوں کی طرف اپنے پیغمبر کبھی کسی مقصد کے لیے بھیجے اور کبھی اس کے بالکل برعکس کسی دوسرے مقصد کے لیے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک نبی نظام اسلامی کو قائم کرنے کی جدوجہد میں کامیابی کے آخری مرحلوں پر پہنچ جائے، دوسرا بیچ کے کسی مرحلے میں یا ابتدائی مرحلہ ہی میں آخر وقت تک کام کرتا رہے اور کوئی تیسرا بجائے دعوت و تبلیغ یا جنگ کے بجائے کسی درمیانی صورت کو اپنے مخصوص حالات میں قابل عمل پا کر اسے اختیار کرے اور ان اشکال کے اختلاف کے باوجود مقصد سب کا ایک ہی ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے نظام زندگی کو مکمل طور پر دنیا میں قائم کرنے کی سعی کرنا۔ لیکن اس اختلافِ اشکال کو یہ معنی پہنانا کہ انبیاء کے مقاصد بعثت ہی سرے سے مختلف و متضاد تھے، اللہ پر ایسا بہتان لگانا ہے جس سے بدتر بہتان شاید کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح تیسرے سوال کا جواب بھی یہ ہوسکتا ہے، اور آج کل کے مسلمان بالعموم یہی سمجھتے ہیں کہ انسان سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ صرف اتنا ہی ہے کہ وہ اس کی پوجا کر لیا کرے اور کچھ مسائل غسل و طہارت اور چند مخصوص حدود حلال و حرام کی پابندی کرے، اس سے آگے اللہ کا کوئی مطالبہ نہیں ہے اور اللہ کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ آدمی زندگی کے وسیع تر معاملات میں اپنے نفس کے قوانین کی پیروی کرتا ہے یا ان شیاطین جن و انس کے احکام کی جو اس کی زمین پر مسلط ہوگئے ہیں۔ مگر یہ جواب موجودہ زمانہ کے دنیا پرستوں کے لیے خواہ کتنا ہی اطمینان بخش ہو اور خواہ "الدین یسر" اور "ما جعل علیکم فی الدین من حرج" کا یہ منشا قرار دے کر وہ اپنے لیے اس سے کتنی ہی سہولتیں پیدا کر لیں، بہرحال یہ تصور عبدیت و بندگی کے تصور کی قطعی نفی ہے۔ بندگی کا شاید اس سے زیادہ مضحکہ انگیز مفہوم کوئی اور نہیں ہوسکتا کہ بندہ چوبیس گھنٹوں میں سے دو گھنٹوں کے لیے بندہ ہو اور باقی اوقات میں آزاد یا صرف فائق سلامی دے دینے پر اس کی بندگی ختم ہو جائے اور پھر سارے کام اپنی یا دوسروں کی منشا کے مطابق کرتے رہنے کی آزادی حاصل ہو۔ پھر وہ خدا تو ہرگز خدا مانے جانے کے قابل نہیں ہے جو ایک طرف اپنے آپ کو انسان کا خالق اور رب بھی کہتا ہو اور دوسری طرف پورے انسان کو نہیں بلکہ اس کے ایک نہایت قلیل اور غیر اہم جز تک اپنی آقائی و فرماں روائی اور اس کی بندگی و غلامی کو محدود رکھنے پر راضی ہو۔ کوئی باپ اپنے بیٹے پر اپنی پدرانہ حیثیت کو، کوئی شوہر اپنی بیوی پر اپنی شوہرانہ حیثیت کو، کوئی حاکم اپنی مملکت اور اپنی رعایا پر اپنی حاکمانہ حیثیت کو اس حد تک محدود کرنے پر راضی نہیں ہوتا کہ چند مراسم اطاعت و وفاداری ادا ہو جانے کے بعد اس کی پدریت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور شوہریت اور حاکمیت کا مقتضا پورا ہوجائے اور پھر بیٹے کو اختیار ہو کہ جس جس کو چاہے باپ بناتا پھرے اور عورت کو اختیار ہو کہ جس جس کو مناسب سمجھے وجہ سکون بنتی پھرے، اور رعایا کو اختیار ہو کہ جس جس کے قانون کی چاہے پیروی کرے، جس کو چاہے ٹیکس دے اور جس جس کے احکام کی چاہے اطاعت کرتی رہے۔ مگر یہ خدا آخر کیسا خدا ہے کہ جو انسان سارا کا سارا اس کا مخلوق اور اسی کا پروردہ، اور اسی کے بل پر قائم و موجود ہے، اس پر اپنی آقائی کو محدود کر لینے اور اس سے بندگی کی چند رسمی باتیں قبول کر کے اسے خود مختار یا ہر ایک کی غلامی کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دینے پر راضی ہے۔

دین اور نبوت اور تقاضائے عبدیت کے یہ تصورات اگر صحیح نہیں ہیں اور فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا دین انسان کی ساری اجتماعی و انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور خدا کا مطالبہ اپنے بندوں سے یہی ہے کہ وہ ہر حیثیت سے اس کے قانون کے پیرو اور اس کی ہدایت کے متبع ہو کر رہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو اسی غرض سے بھیجا تھا کہ وہ اُس برحق نظامِ زندگی کو قائم کرنے کی دعوت دیں اور اسی کی اقامت کے لیے سعی کریں جو خدائے واحد کی اطاعت پر مبنی ہو تو کسی معقول آدمی کے لیے یہ تسلیم کرنا سخت مشکل ہے کہ سارے نبیوں میں سے تنہا ایک حضرت یوسف علیہ السلام ہی انوکھی قسم کے نبی تھے جن کے سپرد دین اللہ کو قائم کرنے کی سعی کے بجائے یہ خدمت کی گئی تھی کہ دین الملک کے تحت وزارتِ مال کی نوکری کریں اور نہ کوئی معقول آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف تو عرب میں دینِ حق کی اقامت میں سعی و جہد فرما رہے تھے اور دوسری طرف آپ کے نزدیک ایک غیر مسلم نظامِ حکومت بھی ایسا برحق تھا کہ ایک مسلم جماعت کے لیے وہ ایک مناسب جائے قیام ہو سکتا تھا۔ جو لوگ دین کو ایک معقول و متناسب نظام کی حیثیت سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کو منتشر اور ایک دوسرے سے بے تعلق اجزا کا مجموعہ سمجھتے ہیں ان کے لیے تو یہ بہت آسان ہے کہ انبیاء کے حالاتِ زندگی، قرآن کی تعلیمات اور دین کے احکام و اوامر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہر ایک کی ایسی تاویلیں اور تفسیریں کریں جن سے ایک جز، دوسرے جز سے اور ایک پہلو دوسرے پہلو سے صریح تناقض کا رنگ اختیار کر لے، لیکن اس دین کو ایک حکیم کے بنائے ہوئے مرتب و مربوط اور متناسب نظام کی حیثیت سے دیکھنے والوں کے لیے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اس دین کے ہر پہلو اور ہر جز کی وہی تفسیر و تاویل اختیار کریں جو کلی نظام کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہو اور کسی ایسی تعبیر کو خواہ وہ کیسے ہی بڑے علماء کی طرف سے پیش کی گئی ہو، قبول نہ کریں، جس سے اس دین کے اندر تناقض، اور اس کی تعلیمات اور انبیاء علیہم السلام کے کاموں کے درمیان تصادم لازم آتا ہو۔

اب ہم سورۂ یوسف کے زیر بحث مقامات اور ہجرت حبشہ کے واقعات سے براہِ راست بحث کریں گے۔

حضرت یوسف علیہم السلام کا قصہ جس طریقے سے سورۂ یوسف میں بیان ہوا ہے، اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب قبل اس کے کہ نبوت سے سرفراز ہوتے، اپنے بھائیوں کی غداری اور ایک تجارتی قافلہ کی خیانت کی بدولت عزیز مصر کے مملوک ہو چکے تھے۔ اس مملوکیت کے زمانہ میں یا اس کے بعد جب کہ آپ قید کیے جا چکے تھے، آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت کا منصب عطا کیا گیا اور اغلب یہی ہے کہ یہ سرفرازی قید ہی کے زمانہ میں ہوئی ہوگی، کیونکہ قید ہونے سے پہلے آپ کے کلام کا انداز پیغمبرانہ شان کا نہیں، بلکہ صرف ایک مردِ صالح کا سا نظر آتا ہے۔

اس حالت میں جب آپ نبوت سے سرفراز ہوئے تو آپ نے معاً اپنی پیغمبرانہ دعوت کی ابتدا کر دی اور ساتھ کے قیدیوں ہی کو اُس چیز کی طرف بلانا شروع کر دیا جس کے لیے آپ مامور ہوئے تھے۔ اس دعوت کا خلاصہ سورۂ یوسف رکوع ۵ میں بیان ہوا ہے جس کا مطالعہ کر کے آج بھی ہر شخص یہ دیکھ سکتا ہے کہ ان کا بلاوا "ارباب متفرقون" کی بندگی کی طرف نہیں تھا، بلکہ ایک رب کی بندگی کی طرف تھا اور وہ بار بار اہل مصر پر یہ واضح کرتے رہے تھے کہ جس بادشاہ کو تم نے رب بنا رکھا ہے وہ میرا رب نہیں ہے، بلکہ میرا رب اللہ ہے اور جس ملت کی میں پیروی کرتا ہوں وہ اللہ ہی کی بندگی سے عبارت ہے۔ یہ تبلیغ جو وہ قید خانہ میں کر رہے تھے، اس کے دوران میں یکا یک یہ صورتِ حال پیش آ گئی کہ دیانت و تقویٰ

© rasailojaraid.com

اور حکمت و بصیرت کے جو غیر معمولی نشانات ان کی ذات سے ظاہر ہوئے تھے، فرماں روائے مصر ان سے متاثر ہوگیا اور اس حد تک متاثر ہوا کہ انھیں یہ توقع ہوگئی کہ اگر وہ سلطنت کے پورے اختیارات اس سے مانگیں تو وہ انھیں دینے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ اب یوسف علیہ السلام کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک راستہ یہ کہ وہ اسلامی انقلاب کے لیے دعوتِ عام، جدوجہد، کشمکش اور جنگ کے طویل عمل ہی کو اختیار کریں، جو عام حالات میں اختیار کرنا پڑتا ہے۔ دوسرا راستہ یہ کہ وہ اس موقع کو جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ان کے ہاتھ آگیا تھا، استعمال کریں اور عقیدت مند بادشاہ سے جو اختیارات مل رہے ہیں، انھیں لے کر ملک کے نظامِ فکر و اخلاق اور نظامِ تمدن و سیاست کو بدلنے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ نے جو بصیرت ان کو عطا کی تھی اس کی بنا پر انھوں نے پہلے راستے کی بہ نسبت دوسرے راستے کو اپنے مقصد کے لیے مفید تر اور اپنی منزلِ مقصود سے قریب تر سمجھا اور اسے اختیار کرلیا۔ یہ غیر اسلامی نظام کی نوکری نہیں تھی جو پیٹ پالنے کے لیے یا ذاتی جاہ و منزلت کے لیے یا نظامِ فاسد کے اندر جزوی مصالح کے لیے کی گئی ہو، بلکہ یہ ایک تدبیر تھی جو اسی ایک مقصد کے لیے اختیار کی گئی تھی جس کے لیے تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت یوسف بھی مبعوث ہوئے تھے۔

جن لوگوں نے اسے محض نوکری سمجھا ہے اور یہ خیال کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے اس کو ذریعہ ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس غرض کے لیے حاصل کیا تھا کہ کافرانہ نظام بدستور قائم رہے اور وہ اس کے تحت بس فنانس منسٹر کی خدمت انجام دیتے رہیں، ان کے نزدیک حضرت یوسف علیہ السلام کا مرتبہ موجودہ حکومتوں اور ریاستوں کے تنخواہ دار ملازموں سے کچھ بھی بلند نہیں ہے، حتیٰ کہ اتنا بلند بھی نہیں جتنا ہمارے اس ملک میں کانگریسی وزارتوں کا مقام ثابت ہوا ہے جن کا طرزِ عمل تمام ملک دیکھ چکا ہے کہ جب تک انھیں اپنے مقصد (آزادیٔ ملک) کے لیے وزارت کے مفید ہونے کا یقین نہ ہوگیا، انھوں نے اور ان کے کسی چھوٹے بڑے شخص نے بھی وزارت قبول کرنے کا خیال تک نہ کیا اور پھر جب وزارتیں قبول کیں تو یہ دیکھ کر کہ فی الواقع جوہرِ اقتدار (Substance of power) ان کی طرف منتقل نہیں کیا گیا ہے، انھوں نے تمام وزارتوں کو لات مار دی۔

یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ اختیارات بادشاہ سے مانگے گئے تھے یا اس سے چھینے گئے تھے اور نہ یہ بات کوئی اہمیت رکھتی ہے کہ حضرت یوسف کے برسرِ اقتدار آتے ہی بادشاہ معزول کردیا گیا یا تختِ سلطنت پر قائم رہا۔ اصل اہمیت جو چیز رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جو منصب طلب کیا تھا وہ آیا کافرانہ نظام کو چلانے کے لیے اور اس کی ملازمت قبول کرنے کی خاطر کیا تھا یا اپنے مقصدِ بعثت یعنی نظامِ اسلامی کو قائم کرنے کی خاطر؟ دوسری چیز جو اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ آیا فی الواقع ان کو ایسے اختیارات ملے تھے یا نہیں جن سے وہ ملک کے نظام میں تبدیلی کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔ ہمارے نزدیک دین اور نبوت کے پورے تصور کا تقاضا یہ ہے کہ ہم حضرت یوسف کے مطالبہ "اجعلنی علیٰ خزائن الارض" کا مقصد نظامِ اسلامی کا قیام سمجھیں اور یہ سمجھیں کہ خزائن الارض کے مطالبہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کا مدعا یہ تھا کہ ملک کے تمام ذرائع و وسائل (Resources) ان کے ہاتھ میں دے دیے جائیں۔ خان بہادر صاحب خواہ مخواہ خزائن کے لفظ کو مالیات کے معنی میں لے رہے ہیں، حالانکہ قرآن میں کہیں بھی یہ لفظ مالیات کے معنوں میں نہیں آیا ہے[1]۔ قرآنی آیات کا تتبع کرنے سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ اس لفظ کا مفہوم وہی ہے جو "ذرائع و وسائل" کا مفہوم ہے اور ظاہر بات ہے کہ کسی شخص کے ہاتھ میں کسی ملک کے تمام ذرائع و وسائل کا ہونا اور اس کا ملک کے تمام سیاہ و سپید پر متصرف ہو جانا دونوں بالکل ہم معنی ہیں۔ اسی بات کی تصدیق توراۃ سے بھی ہوتی ہے جس میں بصراحت یہ بیان

---

[1] مثلاً آیت وللہ خزائن السمٰوٰت والارض۔ وان من شیءٍ الا عندنا خزائنہ۔ ام عندھم خزائن ربک۔
وقال الذین فی النار لخزنۃ جہنم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوا ہے کہ فرعون مصر صرف برائے نام بادشاہ رہا ورنہ تمام ملک عملاً حضرت یوسف کے زیر نگیں ہو گیا[1]

اب رہا یہ سوال کہ حضرت یوسف کے اقتدار حاصل کرنے کے بعد بھی ملک میں دین الملک برقرار رہا جیسا کہ آیت "ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک" سے ظاہر ہوتا ہے، تو اس کے متعلق پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ عام طور پر اس کا جو ترجمہ کیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ مترجمین اس کا یہ مفہوم لیتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام دین الملک کے تحت اپنے بھائی کو نہیں پکڑ سکتے تھے، حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ یوسف کا یہ کام نہ تھا، یا یوسف کے لیے یہ مناسب نہ تھا کہ اپنے بھائی کو دین الملک کے تحت پکڑتا۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی اس محاورہ کا مفہوم عدم قدرت نہیں، بلکہ عدم موزونیت و عدم مناسبت ہی ہے۔ مثلاً ما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب (آل عمران، رکوع ۱۸) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تم کو غیب پر مطلع نہیں کر سکتا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ تمہیں غیب پر مطلع کرے۔ اسی طرح ما کان اللہ لیضیع ایمانکم اور فما کان اللہ لیظلمھم اور ما کان اللہ لیذر المومنین علی ما انتم علیہ میں اللہ تعالیٰ کی عدم قدرت کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ یہ ذکر ہے کہ ظلم اور اضاعت ایمان اور مومنین و منافقین کو غلط ملط چھوڑ دینا اللہ تعالیٰ کا طریقہ نہیں ہے۔ اور خود سورۂ یوسف میں اس آیت سے پہلے ایک مقام پر جو ارشاد ہوا ہے ما کان لنا ان نشرک باللہ من شیء تو اس کے معنی بھی یہ نہیں ہیں کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنے پر قادر نہیں ہیں، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ "ہم لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کریں"۔ پس آیت زیر بحث کو بھی یہ معنی پہنانا صحیح نہیں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام دین الملک پر عمل کرنا چاہتے تھے مگر اس کے تحت اپنے بھائی کو گرفتار نہیں کر سکتے تھے، بلکہ قرآنی استعمالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا صحیح مطلب یہی ہے کہ دین الملک کے تحت اپنے بھائی کو گرفتار کرنا یوسف علیہ السلام کے شایان شان نہیں تھا۔ البتہ اس آیت سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے صاحب اقتدار ہونے کے باوجود کم از کم فرعونی قانون تعزیرات سات آٹھ برس بعد تک (جب کہ حضرت یوسف کے بھائی وہاں پہنچے تھے) ملک میں نافذ تھا۔ لیکن اس کے متعلق اس سے پہلے بھی ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ ایک ملک کے نظام تمدن کو ایک رات کے اندر کلی طور پر تبدیل نہیں کیا جا سکتا اور اسلامی انقلاب کا یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ اقتدار ہاتھ میں آتے ہی جاہلیت کے تمام قوانین و رسوم کو یک لخت بدل ڈالا جائے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ملک کے نظام تمدن کو کلی طور پر تبدیل کرنے میں پورے دس برس لگے تھے۔ لہٰذا اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے دور حکومت میں چند سال تک فرعونی قانونِ تعزیرات یا اس کے ساتھ کچھ دوسرے فرعونی قوانین بھی جاری رہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پیش نظر خدائی قوانین کا اجرا سرے سے تھا ہی نہیں اور وہ فرعونی قوانین ہی ملک میں برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

---

[1] "سو فرعون نے اپنے خادموں سے کہا کہ کیا ہم کو ایسا آدمی جیسا یہ ہے جس میں خدا کی روح ہے، مل سکتا ہے؟ اور فرعون نے یوسف سے کہا چونکہ خدا نے تجھے یہ سب کچھ سمجھا دیا ہے اس لیے تیرے مانند دانش ور اور عقل مند کوئی نہیں۔ سو تو میرے گھر کا مختار ہوگا اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی، فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب سے میں بزرگ تر ہوں گا۔ اور اس نے اسے سارے ملک مصر کا حاکم بنا دیا اور فرعون نے یوسف سے کہا میں فرعون ہوں اور تیرے حکم کے بغیر کوئی آدمی اس سارے ملک مصر میں اپنا ہاتھ یا پاؤں ہلانے نہ پائے گا۔" (پیدائش باب ۴۱ آیت ۳۸ تا ۴۴)۔

خط کشیدہ فقرے صریح طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ فرعون حضرت یوسف علیہ السلام کا عقیدت مند ہو چکا تھا، اگرچہ اس نے آپ کی نبوت تسلیم نہیں کی تھی، تب بھی وہ پہلی ہی ملاقات میں ایمان لانے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ پھر اس کے سات آٹھ برس بعد جب حضرت یوسف کے بھائی مصر پہنچتے ہیں تو حضرت یوسف ان سے کہتے ہیں "پس تم نے نہیں، بلکہ خدا نے مجھے یہاں بھیجا اور اس نے مجھے گویا فرعون کا باپ اور اس کے سارے گھر کا حاکم بنا دیا۔ سو تم جلد میرے باپ کے پاس جا کر اس سے کہو تیرا بیٹا یوسف یوں کہتا ہے کہ خدا نے مجھے سارے ملک مصر کا مالک کر دیا ہے" (پیدائش باب ۴۵ آیت ۸ تا ۹)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب ہجرت حبشہ کے مسئلہ کو لیجیے۔ اس معاملہ کو جس انداز سے پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ حبش میں ایک غیر مسلم حکومت قائم تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی ایک جماعت کو وہاں بھیج دیا تاکہ اس کی رعیت بن کر رہیں۔ پھر صحابہ کرام وہاں غیر مسلم بادشاہ کے وفادار بن کر رہے کیونکہ انھیں اس کے ماتحت عقیدے اور پوجا کی آزادی حاصل تھی، اور جب ایک ہمسایہ بادشاہ نے اس کے ملک پر حملہ کیا تو انھوں نے اس کی فتح یابی کے لیے دعائیں مانگیں۔ لیکن یہ واقعات کی بالکل غلط نقشہ کشی ہے۔ اول تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حبش بھیجا تھا اسی وقت آپ کو اس امر کا اندازہ تھا کہ نجاشی صالحین نصاریٰ میں سے ہے، چنانچہ حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ آپ نے مہاجرین سے اس کی مملکت کے متعلق فرمایا تھا وھی ارض صدق۔ دوسرے مہاجرین کو وہاں بھیجنے کی غرض یہ نہ تھی کہ وہاں کی رعایا بن کر رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کو ہجرت کا مشورہ دیتے وقت یہ فرمایا تھا کہ لو خرجتم الی ارض الحبشۃ حتی یجعل اللہ لکم فرجًا ومخرجًا "کاش تم لوگ حبش کی طرف چلے جاتے یہاں تک کہ اللہ تمھارے لیے کوئی صورت نکالے"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت پیش نظر صرف یہ چیز تھی کہ جو مسلمان کشمکش کے اس مرحلہ میں اپنی قوت برداشت سے زیادہ مصائب کے شکار ہو رہے تھے ان کو آپ نے عارضی طور پر ایک ایسی جگہ بھیج دیا جہاں اس قسم کے مصائب کی توقع نہ تھی اور مقصود یہ تھا کہ بعد میں جب حالات سازگار ہو جائیں تو یہ لوگ وہاں سے واپس آجائیں۔ اس کو نظیر بنا کر یہ نتیجہ نکالنا آخر کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو اگر کسی غیر مسلم حکومت میں عقیدہ اور پوجا کی آزادی حاصل ہو تو یہ اس کے تحت ان کے وفادار رعیت بن کر رہ پڑنے کے لیے کافی ہے اور اس سے آگے کچھ اور مطلوب نہیں۔ پھر جب مہاجرین وہاں پہنچے اور کفار مکہ نے نجاشی سے ان کو واپس مانگنے کے لیے اپنا وفد روانہ کیا اور حضرت جعفر اور نجاشی کے درمیان مکالمہ ہوا تو محدثین اور اہل سیرت کی متعدد روایات کے مطابق نجاشی نے نہ صرف یہ کہ حضرت عیسیٰ کے متعلق اس عقیدہ کی تصدیق کی جو قرآن میں بیان ہوا ہے، بلکہ مزید براں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بھی اقرار کیا۔ اس کے بعد نجاشی کے مسلمان ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ امام احمد نے عبداللہ ابن مسعود کے حوالے سے (جو اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں) نجاشی کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ اس نے کہا مرحبا بکم ولمن جئتم من عندہ اشھد انہ رسول اللہ وانہ الذی نجد فی الانجیل وانہ الرسول الذی بشر بہ عیسی ابن مریم۔ کیا یہ الفاظ کسی غیر مسلم کے ہو سکتے ہیں؟ اور بیہقی میں خود عمرو بن عاص سے جو مہاجرین کو واپس لانے کے لیے کفار مکہ کی طرف سے حبش بھیجے گئے تھے۔ یہ الفاظ مروی ہیں کہ انھوں نے اہل مکہ کو جو رپورٹ دی وہ یہ تھی کہ ان اصحمۃ یزعم ان صاحبکم نبی۔ کیا کوئی شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کر کے بھی غیر مسلم قرار پا سکتا ہے؟ ان روایات سے بڑھ کر معتبر و مستند روایت یہ ہے جو بخاری و مسلم میں ملتی ہے کہ اس شخص کی وفات کی خبر پا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی اور فرمایا مات الیوم رجل صالح فقوموا فصلوا علی اخیکم اصحمۃ "آج ایک مرد صالح نے وفات پائی ہے، اٹھو اور اپنے بھائی اصحمہ کی نماز جنازہ پڑھو"۔ اس کے بعد تو سرے سے اس استدلال کی بنا ہی منہدم ہو جاتی ہے جو ہجرت حبشہ کے واقعہ سے کیا جاتا ہے۔

خان بہادر صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں جماعت اسلامی اور اس کی دعوت اور اس کے کام پر جو اعتراضات فرمائے ہیں ان کے جواب میں کچھ کہنے کی میں ضرورت نہیں سمجھتا۔ ان باتوں کو اس سے پہلے وہ سیاسی کشمکش حصہ سوم کی تنقید میں بیان فرما چکے ہیں اور ان کا جواب بھی میں تنقید کے جواب میں عرض کر چکا ہوں (ترجمان القرآن بابت ماہ ستمبر، اکتوبر، نومبر سنہ ۴۱ء) لیکن آج

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ ان ساری باتوں کو پھر اس طرح دوہرا رہے ہیں کہ گویا کبھی ان کا جواب دیا ہی نہیں گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے طرزِ فکر سے ان کا اور ان کی طرح سوچنے والے لوگوں کا طرزِ فکر بالکل مختلف ہے اور ہماری بات ان کی سمجھ میں اسی طرح نہیں آسکتی جس طرح ان کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ جن سوالات کو وہ اہمیت دے کر بار بار ہمارے سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں، ہمارے نزدیک اصل سوالات وہ نہیں ہیں، بلکہ بنیادی سوال صرف یہ ہے کہ دینِ اسلام کا اصل مطالبہ اپنے پیرووں سے کیا ہے اور امتِ مسلمہ کا حقیقی مشن کیا ہے جس کی خاطر اس کو ایک مستقل امت بنایا گیا ہے۔ جب تک اس مسئلہ میں ہمارے اور ان کے نقطۂ نظر کا اختلاف باقی ہے اس وقت تک ناگزیر ہے کہ راہِ عمل کے ہر قدم میں وہ ہمارے اور ہم ان کے مخالف رہیں اور ہمارا ہر عمل ان کے نزدیک بے عملی اور ان کا ہر عمل ہمارے نزدیک بے عملی یا بدعملی رہے۔ پس فروع اور شاخوں پر ہم سے جھگڑنے میں وہ خواہ مخواہ اپنا اور ہمارا اور ہمارے ناظرین کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ان کو پہلے اصول سے بحث کرنی چاہیے اور جب اصول پر وہ اور ہم متفق ہو جائیں تب کہیں ہمارے اور ان کے درمیان یہ بات زیرِ بحث آسکتی ہے کہ امتِ مسلمہ کے حقیقی مشن کو پورا کرنے کے لیے وہ طریقہ کتاب و سنت کے مطابق ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے یا وہ طریقہ جس پر خان بہادر صاحب اور ان کے طرزِ فکر کے لوگ اب تک کاربند رہے ہیں۔

ایک ضروری گذارش

مرکزِ جماعتِ اسلامی سے خط و کتابت کرتے ہوئے ارکانِ جماعت اور دوسرے کرمفرما ازراہِ عنایت حسبِ ذیل امور کا لحاظ رکھیں:۔

(۱) اپنے ہر خط میں لازماً پورا پتہ نہایت صاف لکھیے۔

(۲) مرکز کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے امور کو یکجا لکھنے کے بجائے علٰحدہ علٰحدہ سلپوں پر لکھیے اور ہر سلپ پر پورا پتہ درج کیجیے ورنہ نہ صرف یہ کہ تعمیل میں دیر ہوگی، اور ہمارا وقت ضائع ہوگا بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ خط کے بعض حصوں کی تعمیل سرے سے ہو ہی نہیں۔

(۳) اپنے مدعا کو کم سے کم الفاظ میں بالکل سادہ طریقہ سے تحریر فرمائیے۔ طویل عبارت آرائی کی وجہ سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ خود آپ ہی کا نقصان ہے۔

نوٹ:۔ مرکز کے مختلف شعبوں کے دائرۂ کار کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ شعبۂ استفسارات، علمی، دینی، فقہی مسائل کے علاوہ تحریکِ اسلامی کے متعلق اصولی مسائل کا جواب دیتا ہے۔

(۲) شعبۂ تنظیم جماعتِ اسلامی، جماعت کے دستور، شرائطِ رکنیت، شمولیتِ جماعت، رفتارِ کار، رفتارِ تنظیم وغیرہ امور کے متعلق معلومات فراہم کرے گا۔ نیز ارکین اور مقامی جماعتوں کے لیے کام کا پروگرام متعین کرنا، ان کی رپورٹیں جمع کر کے ہدایات دینا اور اجتماعات کے متعلق امور طے کرنا اسی شعبہ کا کام ہے۔

(۳) مکتبۂ جماعتِ اسلامی۔ جماعتی لٹریچر کی اشاعت کا کام کرتا ہے۔ کتابوں کے آرڈر مکتبہ ہی کے نام آنے چاہئیں، نیز جماعت کے پورے اشاعتی کام کے متعلق اسی دفتر کو مخاطب کیا جائے۔

۴۔ دفتر ترجمان القرآن کو صرف رسالہ سے تعلق رکھنے والے امور کے لیے مخاطب کیا جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علامہ موسیٰ جار اللہ کا ایک مراسلہ

ترجمان القرآن بابت جمادی الاولیٰ و جمادی الثانی ۱۳۶۲ھ میں مشہور ترکی عالم علامہ موسیٰ جار اللہ کی بعض کتابوں پر میرے قلم سے تنقیدیں نکلی تھیں۔ ان کے متعلق پہلے علامہ کے بعض قدردانوں کے خطوط آئے اور پھر خود علامہ کا ایک طویل مراسلہ مدیر ترجمان القرآن کو اس مطالبہ کے ساتھ موصول ہوا کہ یہ ترجمان میں شائع کر دیا جائے۔ یہ مراسلہ عربی میں ہے۔ اس کا اردو ترجمہ شائع کیا جاتا ہے اور جہاں کہیں مجھے کسی بات کی توضیح یا کسی غلط فہمی کے ازالہ کی ضرورت محسوس ہوئی ہے اس کو میں نے نیچے فٹ نوٹ میں لکھ دیا ہے۔ علامہ کے مراسلہ کا عنوان ہے "امت کو اللہ کی کتاب سے وہم احتیاط کی بنا پر محروم نہ کرو"۔ پورے مراسلہ کا ترجمہ درج ذیل ہے اور حتی الوسع اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ علامہ موسیٰ جار اللہ جو کچھ فرمانا چاہتے ہیں وہ بے کم و کاست لوگوں کے سامنے آ جائے۔ یہاں تک کہ اسی خیال کی وجہ سے ترجمہ کی خوبیوں سے زیادہ نفس الفاظ کی رعایت کرنی پڑی ہے۔

امین احسن اصلاحی

وانہ لکتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید (۴۱ : ۴۱)

اور یہ ایک کتاب عزیز ہے جس میں نہ باطل اس کے آگے سے داخل ہو سکتا اور نہ اس کے پیچھے سے۔ ایک حکیم و حمید کی اتاری ہوئی ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے اتارنے میں جو حکمت ملحوظ رکھی ہے اپنے دعوائے احتیاط کو اس سے زیادہ محکم اور اس کی کتاب کی حفاظت کے باب میں، اس کی عزت و مجد سے زیادہ قوی نہ قرار دو۔

میں علوم قرآن کے بعض ابتدائی مباحث پر چند کتابیں لکھیں۔ پھر اللہ کی مدد سے ان کو چھاپ کر شائع کیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ میں نے ہندوستان کے مدارس کو دیکھا کہ انھوں نے قرآن کی تعلیم کو چھوڑ رکھا ہے اور قرآنی علوم و مطالب ان کے نصاب تعلیم سے بالکل خارج ہیں۔ میں نے یہ کتابیں طلبہ کے استفادہ کے لیے شائع کیں نہ کہ مدارس کے اساتذہ اور ہندوستان کے علماء کے لیے۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان کے علماء حضرات بڑے لوگ ہیں۔ دوسروں کے علوم و فنون سے بالکل مستغنی اور جو کچھ ان کے پاس ہے اس میں سرمست۔ میں نے ان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں پایا جو دوسرے کی سچی بات اور صالح فکر کو قبول کر سکتا ہو اور کسی کو بھی نہیں پایا جو تعلیم و افادہ کی مسند پر بیٹھ کر اپنے آپ کو بڑی چیز نہ سمجھنے لگتا ہو اور دوسرے کی کسی کوشش کی کماحقہ قدر کر سکتا ہو۔

ان کے آپس میں شدید اختلافات و نزاعات ہیں جن کے سبب سے باہم خوب جوتیوں چلتی رہتی ہیں اور ایسی حقیر باتوں پر جن کا امت کی صلاح و فلاح اور اس کی مذہبی و علمی خدمت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بڑی بڑی عداوتیں اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ حالانکہ ضرورت و اہمیت کے اصلی مسائل میں یہ لوگ بالکل چپ سادھے ہوئے ہیں۔

علمائے ہند کو اس بات کی طرف بھی ذرا توجہ نہیں ہے کہ کسی مسئلہ نزاعی کا کوئی آخری اور قطعی حل پانے کی کوشش کریں کہ یا تو امت کسی ایک بات پر متفق ہو جائے یا ان چند پہلوؤں کے جواز پر متفق ہو جائے جن کی وجہ سے اس مسئلہ نزاعی پر ہنگامے برپا ہیں۔ میں نے تو نہ سنا اور نہ کبھی دیکھا کہ

© rasailojaraid.com